اسلام اور وطنیت

از جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

[پچھلے دنوں قومیت اور وطنیت پر جو گرما گرم بحثیں ہو چکی ہیں، ان سے اس مضمون کو کوئی تعلق نہیں۔ یہاں ان لفظی نزاعات سے بالکل صرف نظر کرکے وطن کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ کوئی محتاج توضیح چیز نہ تھی اور اس عنوان پر قلم اٹھانا خواہ مخواہ ایک ایسے مسئلے کو اہمیت دیدینا ہے جو مسلمان کی نگاہ میں کبھی اہم نہ تھا، مگر زمانہ کی ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ اس بے حقیقت چیز کو حقیقت کی حد تک پہنچا دیا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان علی الاعلان اسے حقیقت ہی کی حیثیت سے قبول کرتے جا رہے ہیں حتی کہ اب تو اسلام اور وطن پرستی ایک کرکے رکھ دی گئی ہے]

حب وطن اور وطنی عصبیت نئی چیزیں نہیں ہیں۔ آغاز تمدن سے چلی آ رہی ہیں لیکن عملاً جتنا فروغ اور احترام انھیں نئی تہذیب نے بخشا ہے پرانی دنیا اس کا تصور بھی نہ کر سکی ہوگی۔ اب وقت کی فیاضی نے وطن کو وہ تمام حقوق دے دیے ہیں جو کسی معبود ہستی ہی کے شایان شان ہو سکتے ہیں یعنی وطن ہی وہ چیز ہے جس کی حرمت، خدمت، حمایت اور تقدیس شرف انسانی کی آخری معراج اور نظامِ حیات کے دائرہ کا مرکزی نقطہ ہے۔ اصولِ اخلاق، آئین سیاست، ضابطۂ تہذیب اور قانونِ معیشت و معاشرت مستقل حقایق کے بجائے وقتی مفروضات ہیں جو وطنی مصالح کے اشارہ پر ہر آن ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ خدا میرے وطن کے ساتھ ہے کوئی کہتا ہے میرا وطن خدا کا اپنا وطن ہے۔ اور کوئی یہ کہکر کہ "میرا وطن ہی خدا ہے" آگے بولی بولنے والوں کی زبان ہی بند کر دیتا ہے۔ گویا پہاڑ اور دریا صرف زمین ہی کے خطوں کو الگ نہیں کرتے بلکہ انسانیت کے

مفہوم کو بدل دیتے ہیں۔ خدائی تک کو تقسیم کر ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب وطن کی عظمت و کبریائی کا یہ عالم ہے تو اس کی محبت اور عصبیت مقدس ترین جذبہ کیوں نہ ہو؟ اس کی پرستش روشن خیالی کا منتہیٰ کیوں نہ ٹھیرے؟ اس کی راہ میں لڑنے والا غازی اور مجاہد کیوں نہ مانا جائے؟ اور اس کی آن پر سر دینے والا شہید اور زندۂ جاوید کیوں نہ کہا جائے؟۔

مہذب دنیا نے وطن کے ان حقوق کی حمایت میں اتنا شدید پروپیگنڈا کیا کہ مشرق کی "نیم مہذب" اقوام کو ان کی واقعیت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ اسلامی ممالک کے وہ حصے جو اس سرچشمۂ تہذیب سے نسبتہً زیادہ قریب تھے سب سے پہلے انھوں نے عملاً اس تصور کو قبول کیا اور خدا جانے مغرب کے اس ظاہر فریب اور ہلاکت بداماں تصور کی گرفت سے ان کے ذہن کب آزاد ہوں گے لیکن اب تو اس ذہنی غلامی کا ماتم کرنے کے لیے ہمیں نہ اصفہان جانے کی ضرورت ہے نہ انقرہ، یہ رو ہمالہ کی دیواروں کو توڑ کر ہندوستان میں بھی داخل ہو چکی ہے اور طوفان کی سی تیزی کے ساتھ پھیلتی جارہی ہے، اور جو ایک آدھ شکستہ اور نیم جان بند ہماری امیدوں کا آخری سہارا تھے کہ وہ اس رو کو روکیں گے، وہ بھی راہ سے ہٹتے جارہے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ تو وہ ہیں جو علیٰ وجہ البصیرت اسے اسلام کے خلاف سمجھ رہے ہیں لیکن آزادی کے جوش اور سیاستِ حاضرہ کے مصالح نے ان کی زبانیں گنگ کردی ہیں۔ دوسرا گروہ ذرا ان سے زیادہ "روشن خیال" اور ساتھ ہی "جری" اور "باحمیت" بھی ہے۔ اس سے غیر مسلموں کا یہ طعنہ کہ "مسلمانوں میں وطن کی محبت نہیں وہ بھارت ماتا سے زیادہ عرب کا درد رکھتے ہیں" سہا نہ گیا اور اس نے اس دلخراش طعنہ کے جواب میں ع

کہ حب الوطن ہے نشاں مومنیں کا

کا ترانہ گاتے ہوئے چیلنج کیا کہ جسے وطن پرستی کا دعویٰ ہو سامنے آئے اور بتائے کہ کس کی شریعت "حب الوطن من الایمان" کی تعلیم دیتی ہے؟ پھر اس سراسر مادہ پرستانہ جملہ کو ارشادِ نبوی کی حیثیت سے اس قدر مشہور کیا گیا کہ اچھے اچھے اربابِ فہم اس دھارے میں بہ گئے۔ اور اگر روایتہً نہیں تو معنیً اسے فطرتاً اسلام کی صحیح ترجمانی سمجھنے لگے۔

ظاہر ہے کہ جب وطن کی محبت جزو ایمان ہے تو وطن کی راہ میں لڑے اور مرے بغیر (یعنی جہاد کئے) اور سر میں سودائے شہادت رکھے بغیر، ایمان کی تکمیل کیوں کر ہو سکتی ہے۔ اور کسی مسلمان کے خلوصِ ایمان کے ثبوت میں اس کی وطن پرستی سے بڑھ کر اور کون سی دلیل ہو سکتی ہے؟

لیکن کیا حبِ وطن کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر یہی ہے؟ سطور ذیل میں ہم اسی سوال پر غور کرنا چاہتے ہیں، اور قطع نظر اس سے کہ فقیہان قوم کیا کہتے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ خدا اور اس کا رسول کیا کہتا ہے۔

حبِ وطن کا وجود ایک بدیہی اور مسلّمہ حقیقت ہے، ایسی بدیہی اور مسلّم کہ اس پر کسی عقلی یا نقلی دلیل پیش کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہر انسان کی طبیعت بجائے خود اس پر گواہ ہے۔ اسے جتنا لگاؤ کافر کی فطرت سے ہے اتنا ہی ایک مومن کی فطرت سے بھی ہے۔ اس کے وجود سے بڑے سے بڑے صاحب ایمان کا دل و دماغ خالی نہیں ہو سکتا۔ اس نے تو اپنے وجود کا اعلان اس قلب اور زبان سے کرایا جسے مہبطِ وحی اور لسانِ وحی کہا جاتا ہے۔ مکہ سے نکلتے وقت ایک طرف چشم مبارک سے غم و حسرت کے آنسو بہ رہے تھے، دوسری طرف زبان بے اختیار کہہ رہی تھی کہ "اے مکہ تو مجھے ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہے، پر کیا کروں تیرے ہی فرزند تیری آغوش سے مجھے محروم کر رہے ہیں"۔ اور پھر بلال رضی اللہ عنہ کے وہ نغمات درد تو آج تک ضرب المثل ہیں جو ان کی مضطرب روح کی گہرائیوں سے یادِ وطن میں نکل نکل کر مدینہ کی پہاڑیوں میں گونجا کرتے تھے۔ غرض ایمان یا عدم ایمان کوئی شئے بھی اس جذبۂ بشری پر اثر انداز نہیں ہو سکتی، بعینہٖ اسی طرح جس طرح ماں کی، باپ کی، بیٹی کی، بیوی کی، بھائی کی، بہن کی، احباب اور اقارب کی، کسی کی بھی محبت پر ان اعتقادی نزاعات کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہ تو سب کے سب خالص بشری جذبات ہیں جو بلا لحاظ کفر و ایمان بنی نوع انسان کی سرشت میں صناع ازل نے اس وقت سے ودیعت رکھے ہیں جب خود انسان کو ان کے وجود کا احساس بھی نہ تھا۔ چنانچہ قرآن حکیم خود اس حقیقت کو تسلیم کر کے فطرتِ انسانی کی ساخت کے متعلق فرماتا ہے:-

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ　　　بنی نوع انسان کو فطرتاً مرغوبات دنیوی یعنی بیویوں،

النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ الخ (آل عمران۔ رکوع ۲)	بیٹوں، سونے چاندی کے بڑے بڑے ڈھیروں، عمدہ عمدہ گھوڑوں، مویشیوں اور کھیتوں کی محبت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

وطن کی محبت بھی اس "حُبّ الشَّهَوٰتِ" کے دائرے سے خارج نہیں۔ حبِ شہوات سے مراد ہے مادیات کی محبت۔ وطن کی محبت بھی دیگر تعلقات دنیوی کی طرح ایک مادی اور دنیوی تعلق کا نام ہے۔ بلکہ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو انھیں تمام اشیاء کی محبت ہی حب الوطن کی محرک اور علت بلکہ عین حبّ وطن ہے۔ انسان جس ماحول اور سوسائٹی میں، جن احباب اور متعلقین کے درمیان اور جن لوازم زندگی کے ساتھ رہتا سہتا ہے، ان سے اسے ایک خاص انس پیدا ہو جاتا ہے، اسی انس کا دوسرا نام حُبِّ وطن ہے۔ اس انس کے وجود کو قرآن تمام نوع انسانی یعنی "النَّاس" کی جبلت میں مرکوز بتاتا ہے۔ اس "النَّاس" کے فرد جس طرح ابوجہل اور ابولہب ہیں اسی طرح صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ بھی۔ کسی کی خلقت "زُيِّنَ لِلنَّاسِ" کے حکم عام سے باہر نہیں ہے۔ پھر ان عام جذباتِ انسانی کو کفر و ایمان کے جھگڑوں سے کیا تعلق؟

مادی تعلقات کے متعلق اسلام کا نظریہ سب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حبِ وطن کے مخصوص تعلق کے بجائے عام تعلقاتِ دنیویہ کے بارے میں ہم اسلام کا نقطۂ نظر سمجھ لیں۔ کیونکہ زیر بحث مسئلہ بھی اسی ضمن میں خود بخود حل ہو جائیگا اور یوں بھی قرآن جب کبھی ان دنیوی تعلقات اور مادیات سے متعلق جذباتِ انسانی کے بارے میں کچھ فرماتا ہے تو زیادہ تر ان کی مجموعی حیثیت کو ہی سامنے رکھ کر فرماتا ہے۔ کسی تعلق کی جداگانہ حیثیت اس کے دائرۂ بحث میں بہت کم آتی ہے۔

یقیناً جہاں تک ان جذبات کے نفس وجود کا تعلق ہے، وہ دیر و حرم کے جھگڑوں سے بے نیاز ہیں۔ وہ اپنا یہ حق ہر شیخ و برہمن سے حاصل کئے ہوئے ہیں۔ محل نزاع یہ نہیں ہے کہ یہ جذبات آدمی میں ہونے چاہئیں یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کی جائز حد کیا ہے، اور انسان کے نفس پر ان کے حقوق کس قدر ہیں۔

اسی سوال پر پہنچ کر اسلام اور جاہلیت کے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اسلام ہر مادّی تعلق کو چند حدود سے مقید کرتا ہے اور جاہلیت انھیں توڑنے پر اصرار کرتی ہے۔ (حبِ وطن کے بارے میں بھی دونوں کے تصورات بالکل ایسے ہی جداگانہ واقع ہوئے ہیں۔ جاہلیت وطن ہی کو دین وملت بلکہ خدا بھی سمجھ لے تو بعید نہیں، مگر اسلام وطن کی محبت کو نہ اتنی تقدیس کا مستحق سمجھتا ہے اور نہ اسے اتنے غیر محدود حقوق دیتا ہے)۔ اسلام دنیا کی تمام مرغوبات سے حظ اٹھانے کی اجازت تو دیتا ہے لیکن اپنے نظام اور اصولِ کار میں کسی مادّی شئے کے اثر اور اقتدار کو قبول نہیں کرتا۔ بالفاظ دیگر وہ دنیا کو برتنے تو دیتا ہے لیکن پوجنے نہیں دے سکتا۔ اس کے دستور العمل (قرآن) کے قریباً ہر صفحہ میں یہ وضاحت موجود ہے۔ چنانچہ آیت مذکورہ بالا کے آخری الفاظ ہی میں ارشاد ہوتا ہے ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ یعنی یہ دنیا اور اس کی تمام چیزیں جن کی طرف میلان انسان کی فطرت میں داخل ہے "متاعِ قلیل" ہیں۔ ان سے تمتع تو ضرور کرو۔ لیکن انھیں کو مقصود بالذات سمجھ کر ان کی پرستش میں نہ لگ جاؤ، تمھاری منزلِ مقصود اس سے بلند تر ہے۔ ان حیاتِ دنیوی کی زینتوں پر اگر تم فریفتہ ہو گئے اور انھیں کے ہاتھوں میں اپنے نظامِ حیات کی باگیں دے دیں تو یقین کرو تم مقصدِ حیات کی تکمیل میں ناکام اور زندگی کی آزمائش گاہ میں فیل ہو گئے۔ کیونکہ ہم نے تمھیں اس واسطے نہیں پیدا کیا کہ دنیوی علائق کی سرمستیوں میں غرق ہو جاؤ، بلکہ اس آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے کہ ان بندشوں کے اندر بھی کون اپنی عقل اور روح کو آزاد اور زندہ رکھتا ہے اور ان میں گرفتار ہونے کے بجائے ان کے سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتا ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ ... وہ اللہ جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمھیں آزما کر

لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ دیکھے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرتا ہے۔

اور یہ آزمائش اس وقت تک نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ اس امتحان گاہ (دنیا) کے اندر بنی آدم کے لیے مزلاتِ اقدام نہ پیدا کیے جاتے۔ چنانچہ وہ پیدا کیے گئے اور اس کثرت اور قوت کے ساتھ کہ آدمی میں اگر حقیقی

بینائی ہو تو اپنی کمزوریوں کے مقابلہ میں ان کی بے پناہی اور آفاق گیری کو دیکھ کر چیخ اٹھے۔ وہ مزلات کیا ہیں؟ یہی مرغوباتِ نفس جن کی طرف آیتِ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے، اور جن کا ایک جامع نام کتاب اللہ نے "متاعِ حیاتِ دنیا" رکھا ہے۔ یہی متاعِ دنیا انسان ظلوم وجہول کے لیے مزلّہ اقدام ہے۔ یہ نہ ہوتی تو یہ عالمِ عنصری، دار ابتلا بھی نہ بنتا۔ اسی لیے انسان کو بار بار چوکنا رہنے کی تاکید کرتا ہے:۔

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔ (لقمان۔ ۴)

پس تمھیں یہ دنیوی زندگی (اصل مقصد اور انجام) کی طرف سے دھوکے میں نہ ڈال دے اور نہ خدا کے بارے میں فریب کار شیطان تمھیں دھوکا دینے پائے۔

اور پھر یہی وہ خطرناک پہلوانِ زخارفِ ارضی کا ہے جس کی وجہ سے انھیں قرآن میں جگہ جگہ "فتنہ" کہا گیا ہے، اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (تغابن۔ ۲) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (انفال۔ ۳) "فتنہ" قرآنی اصطلاح میں ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن میں خیر و شر دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ اگر انسان ان کے حدود پہچان کر ان کا صحیح استعمال اور استفادہ کرے تو وہ اس کے لیے سراپا خیر ثابت ہوتی ہیں لیکن اگر اس نے اس امتیاز اور استعمال میں غلطی کی تو یہی چیزیں اس کے حق میں شر بن جاتی ہیں، اور انسان اپنی آزمائش میں ناکام ہو کر معتوبِ الٰہی قرار پاتا ہے، اور دنیا کی یہ ساری نعمتیں اس کے لیے دشمن ثابت ہوتی ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے انھیں انسان کا "عدو" بھی کہا گیا ہے یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (تغابن۔ ۲) یعنی اے ایمان والو تمھاری بیویوں اور بچوں ہی میں سے تمھارے دشمن ہیں، پس ان کی محبت کے فتنوں سے بچتے رہو۔ کیونکہ انسان کے راہ قسط و عدل سے ہٹنے کا سب سے بڑا واحد سبب یہی عشقِ مال اور حبِ عیال ہی تو ہے جو انسان کو ادائے فرض سے روکتا ہے۔

یہیں سے عملاً کافر اور مومن کا امتیاز شروع ہوتا ہے۔ کافر مشرک اور ملحد انھیں چیزوں میں اپنے کو گم کر دیتے ہیں۔ یہ دنیا اور اس کے علائق ان کی روح کو، ان کے قلب کو، ان کے دماغ کو اپنی اسیری میں اس طرح لے لیتے ہیں کہ وہ انھیں کو حاصلِ زندگی اور منتہائے حیات سمجھنے لگتے ہیں، یعنی شقاوت کے اس درجۂ کمال

پر پہنچ جاتے ہیں جسے قرآن بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا سے تعبیر کرتا ہے۔ اور ان کے برعکس مومن اس متاعِ ارضی کو اپنے دل و دماغ کا معبود نہیں بناتا۔ وہ ان سے ایک فطری رغبت تو ضرور رکھتا ہے مگر یہ رغبت اس کو اصل مقصد حیات سے بے گانہ نہیں کر سکتی۔ جہاں متاعِ دنیا نے معبودیت کا مطالبہ کیا اور مومن کے لیے وہ "عدو" کے حکم میں ہو گئی۔ پھر مومن کا فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے اس "عدو" کے حلق پر چھری پھیر دے، خواہ یہ چھری اس رغبت کے ساتھ ساتھ خود اس کے دل کے ٹکڑے ہی کیوں نہ کر ڈالے۔ بیٹے سے بڑھ اس آسمان کے نیچے اور کون سی چیز محبوب بنائی گئی ہے؟ لیکن جب ایسی محبوب ترین متاع کو طوفان کی موجیں نگلنے کے لیے لپکتی ہیں اور وقت کا سب سے بڑا خدا پرست انسان باوجود پیغمبرانہ عزیمت کے پدرانہ محبت سے مغلوب ہو کر بیتابانہ کبھی بیٹے کو پکارتا ہے کہ یٰبُنَیَّ ارْکَبْ مَّعَنَا اور کبھی آسمان کی طرف مترحم نگاہیں اٹھا کر کہتا ہے کہ یَا رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَھْلِیْ تو معلوم ہے کہ خدا کی بے نیاز عدالت سے اس درخواست کا کیا جواب ملتا ہے؟ عقیدت اور ممتا کی اس فطری کشمکش پر پیغمبر کو کن لفظوں میں تنبیہ ہوتی ہے؟ صدا آتی ہے کہ یا نُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّیْ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاھِلِیْنَ (ہود-۴) اے نوحؑ! بیٹے کے ساتھ تمہاری شیفتگی مسلّم مگر یہ حق و باطل کے امتیاز کا وقت ہے، اس وقت تمہارے بشری جذبات کا اقتضاء کوئی چیز نہیں۔ خبردار جذبات کے طوفان میں تمہارے پائے ثبات و استقامت کو لغزش نہ ہونے پائے اِنِّیْ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاھِلِیْنَ۔ حق کی راہ میں جو محبت حائل ہو اس کو دل میں رکھنا جاہلوں کا کام ہے، ایمان کی آزمائش گاہ میں ناکام ہونے والوں کی راہ ہے۔ اس وقت بیٹے کی محبت ایک خطرناک فتنہ کی شکل میں تمہارے سامنے آئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو اپنے پیروں سے کچل کر رکھ دو۔ حق پرستی کا دشمن ہو کر تمہارا بیٹا، تمہارا لختِ جگر ہونے کے باوجود، تمہاری کسی محبت اور سفارش کا مستحق نہیں، حتیٰ کہ وہ اب تمہارا بیٹا بھی نہیں کہا جا سکتا، لہٰذا تم اپنے اس جگر کے ٹکڑے کو نہنگ اجل کے منہ میں جانے دو۔

اسوۂ ابراہیمی کو لیجیے۔ باپ سے بڑھ کر مخلصانہ ہمدردی اور تعظیم کا مستحق کون ہے؟ لیکن جب توحید پرست بیٹے کو یقین ہو جاتا ہے کہ باپ کی سیاہ فطرت پر شعاعِ حق کا انعکاس ناممکن ہے تو وہ نہ صرف اس سے ترکِ موالات کرتا ہے بلکہ اس کے لیے ہدایت اور مغفرت کی تمنا بھی اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے، اور باپ بیٹے جیسا گہرا فطری (لیکن مادی) تعلق ایک منٹ کے لیے بھی اس کے ارادہ میں تزلزل نہیں پیدا کرتا۔

اور قریب آئیے، اسوۂ فاروقی پر نگاہ ڈالیے کہ اس سراپائے ایمان کی سیرت بجائے خود حقیقت اسلام کی ایک مکمل اور خالص تصویر ہے۔ بدر کے میدان سے اسیرانِ جنگ گرفتار ہو کر آتے ہیں۔ دربار نبوت میں معاملہ پیش ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ کیا کیا جائے۔ سب سے پہلے سیدنا عمرؓ کی آواز آتی ہے کہ یا رسول اللہ میں جانتا ہوں کہ ہمارے سامنے یہ سب ہمارے اپنے ہی دست و بازو بلکہ دل و جگر پا بزنجیر کھڑے ہیں لیکن ہیں یہ سب کے سب حق کے دشمن اور توحید سے برگشتہ۔ لہذا حکم دیجیے کہ ہم میں سے ہر ایک خود اپنے قریبی عزیز کی گردن مارے۔ کیونکہ ہمارے ان کے لاکھ نسبی اور وطنی تعلقات سہی، مگر ایمان کے دشمن کسی صلہ رحمی، اور ان کی محبت کسی رعایت کی مستحق نہیں۔ اس مشورہ پر خواہ عمل نہ ہوا ہو لیکن اس معاملہ کے متعلق حاکم اعلیٰ کا جو فیصلہ آیا، اس کی روشنی میں کون ہے جو اس مشورہ کی ایمان نوازی اور صحت و عظمت کا منکر ہو سکے۔

اسلام اور ایمان کے ضابطہ میں مادی تعلقات اور بشری جذبات کی قدر اور رعایت جو کچھ ہے بس اتنی ہے۔ اس کے آگے اسلام کی سرحد ختم اور کفر کی مملکت اور اس کا آئین شروع ہو جاتا ہے جہاں یہی دنیا اور اسی دنیا کی لگاوٹیں ہی سب کچھ ہیں۔ ان حدود میں رہنے والے خدا کے پیدا کیے ہوئے ان تمام فتنوں کے سامنے سر جھکائے ان کی پرستش میں دن رات مشغول رہتے ہیں اور دیدۂ عبرت رکھنے والوں کو دکھاتے رہتے ہیں کہ دنیا کے تعلقات اپنی جائز حد سے گذرنے کے بعد کس طرح انسان کے دشمن بن جاتے ہیں اور اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ

کی شکل کیا ہوتی ہے۔

خدا کی سنت یہی ہے کہ وہ انھیں فتنوں کے ذریعہ سے اپنے فرمانبردار بندوں اور سرکش و نافرمان باغیوں کو الگ کیا کرتا ہے، اور کسی فرد یا جماعت کو اس وقت تک اپنی مقبولیت کا شرف نہیں بخشتا جب تک کہ وہ فتنوں کی اس بھٹی میں تپا کر جانچ نہ لیے جائیں، اور آزمائشوں سے یہ بات کھل نہ جائے کہ کھرا کون ہے جو اپنے اصلی مقصدِ آفرینش کو یاد رکھتا اور دنیا کے سارے علائق پر اسے ترجیح دیتا ہے، اور کھوٹا کون ہے جو دنیا کے عشق میں سرشار ہو کر اپنے منتہا سے غافل ہو بیٹھا ہے۔ اسی بات کو یوں فرمایا گیا ہے کہ:۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (عنکبوت - ۱)

کیا لوگوں کو گمان ہے کہ وہ صرف اتنا کہنے پر کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، چھوڑ دیے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہ ہوگی؟

یعنی "فتنہ" اور آزمائش کی راہ سے بہرحال گذرنا ہوگا تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون مال و اولاد، اعزہ و اقارب اور گھربار کے رشتوں کو اپنی فطری حد میں رکھ کر اللہ کے تعلق کو سب پر بالا و برتر رکھتا ہے، اور کون ایسے فریب کار ہیں جو نام تو توحید کا لیتے ہیں لیکن ان کے قلوب انھیں دنیوی رشتوں کی مضبوط گرفت میں جکڑے ہوئے ہیں، اور ضرورت کے وقت اس گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ۔ (بقرہ - ۱۹)

اور ہم تمھیں کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جان اور پیداوار کی کمی سے ضرور آزمائیں گی اور اے پیغمبر ان مصائب پر صبر کرنے والوں اور ہماری آزمائش میں پورا اترنے والوں کو فلاح کی خوشخبری سنادو۔

اس آیت اور پہلی آیت (زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوٰتِ) دونوں کو ایک دوسری کی روشنی میں دیکھیے تو صاف نظر آتا ہے کہ جن چیزوں کی محبت انسانی سرشت میں رکھی گئی ہے انہی میں انسان کی اخلاقی طاقت کے لیے آزمائش بھی رکھ دی گئی ہے اور یہی آزمائش وہ فیصلہ کن چیز ہے جس سے خدا پرست اور دنیا پرست ممیز ہوتا ہے۔ سارے مادی علائق، دنیوی رشتے، اور بشری جاذبے اسی امتحان کے لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ انسانوں میں سے کون اتنا بودا اور کمزور ہے کہ ان کا

بندہ اور پرستار بن کر خدا کی محبت کو ان کی محبت پر سے قربان کر دیتا ہے، اور کس میں اتنی طاقت ہے کہ ان سب چیزوں کو اپنے لیے اور اپنے آپ کو خدا کے لیے سمجھے اور آزمائش کے وقت ہر ایک چیز کو خدا کی خوشنودی کے لیے قربان کر سکے۔ اسی لیے مومن کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اس کی جان اور مال یعنی اس کی پوری دنیا خدا کے ہاتھوں بکی ہوئی ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ-۱۴) اور اگر کوئی مدعیِ ایمان اس ذوقِ تسلیم و رضا سے آشنا نہیں تو وہ نیکی اور تقویٰ کا مقام رفیع ہرگز نہیں پا سکتا لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران- ۱۰) گویا اسلام نام ہی ہے قربانی کا، یعنی جان اور مال کی قربانی کا، مرغوباتِ نفس اور لذاتِ زندگی کی قربانی کا، مودتِ قربیٰ اور حبِ وطن کی قربانی کا اور ان تمام دنیوی تعلقات اور مادی رغائب کی قربانی کا جن کی کشش اور محبت خالقِ کائنات کی طرف سے انسانی سرشت میں سمو دی گئی ہے، وہی کشش اور محبت جس کے وجود کا اعتراف آیت زُيِّنَ لِلنَّاسِ الخ میں کیا گیا ہے۔

اب ان ساری تفصیلات کے بعد سوال پیدا ہوگا کہ آخر یہ تمام چیزیں، جن کی قربانی کا نام ہی قرآن کی اصطلاح میں اسلام ہے، کس چیز پر قربان کی جانی چاہئیں؟ بالفاظ دیگر انسان کا وہ "منتہائے حیات" اور "اصل مقصدِ زندگی" کیا ہے جس کے مقابل دنیا کی بڑی سے بڑی متاع محبوب ناقابلِ التفات اور فراموش ہو جانی چاہیے؟ اس کا جواب قرآن یہ دیتا ہے:-

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ	اے پیغمبر مسلمانوں سے کہہ دو کہ اگر تمھارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں
وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ	اور تمھارا خاندان اور تمھارا کمایا ہوا مال، اور تمھاری تجارت
وَاَمْوَالُ اِۨقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ	جس کے مندا پڑ جانے کا تمھیں ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے، اور تمھارے دل پسند
كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ	مکانات، یہ ساری متاعِ دنیوی تمھارے نزدیک خدا اور اس کے
مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ	رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں،

فَتَرَبَّصُوا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (توبہ - ۳)

تو انتظار کرو یہاں تک کہ خدا اپنا حکم اور فیصلہ صادر کرے اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

غور فرمائیے، پھر انھیں متاعہائے ارضی کا ذکر ہے جنھیں گذشتہ آیات میں انسان کی مرغوب خاطر ظاہر کیا گیا تھا۔ یہاں بھی ان اشیاء سے انسان کی فطری دل بستگی کا نہ انکار کیا گیا ہے اور نہ اسے مذموم اور مخالفِ ایمان قرار دیا گیا ہے، بلکہ اشارتاً اس کا وجود بطور حقیقتِ مسلّمہ کے تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ مطالبہ یہ کیا گیا ہے کہ عشق اور طلب اور سعی کا اصلی منتہا صرف ذاتِ خداوندی ہے۔ جب تک دنیا کی رغبتیں خدا کے اس حق پر اثر انداز نہیں ہوتیں، انسان ان سے تعلق رکھنے میں حق بجانب ہے، اس پر کوئی گرفت اور الزام نہیں۔ لیکن جب مال و دولت، یہ فرزند و زن، یہ خویش و اقارب، یہ نسل و خاندان، یہ دیار و وطن اور یہ سب سامان زندگی انسان کے لیے قفسِ روح اور زنجیرِ پا بن جائیں اور محبوبِ حقیقی کی طلب و دعوت پر اسے حاضر نہ ہونے دیں تو ان سب چیزوں کی محبت حرام ہو جاتی ہے اور یہ حرام محبت کفر کا سرچشمہ ہے، جس طرح خدا کی طلب میں اس محبت کو قربان کر دینا اسلام کا سرچشمہ ہے۔

خدا کی محبت اور عشق ایک باطنی کیفیت کا نام ہے اور اس کی خارجی تفسیر یا اس کا مظہر عبادت ہے، یعنی دائماً خدا کی خوشنودی کے مطابق عمل کرنا۔ اصل شے کو آپ ایمان سے اور اس کے مظہر کو اسلام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہی ایمان، انسانی ضابطۂ حیات کی تشکیل میں اساس کی حیثیت رکھتا ہے اور اس اساس پر جو عمارت کھڑی ہوتی ہے، اسی کا نام اسلام ہے۔ گذشتہ آیات میں جس چیز کے لیے دنیا اور اس کے تعلقات کی قربانی کا ذکر ہے وہ یہی "اساس" اور یہی "عمارت" ہے۔ قرآن دنیا کی محبوب سے محبوب چیز کو بھی یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس عمارت کی صحیح تعمیر میں خلل انداز ہو اور اس کی وجہ سے اس میں رخنے پڑیں۔ وہ اسے تو تسلیم کرتا ہے کہ دنیا اور اس کی ساری متاع سے انسان تعلق رکھے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو، اور تسلیم کیا معنی وہ تو اس پر زور دیتا ہے مگر ساتھ ہی اس کا یہ بھی مطالبہ ہے

کہ جب کبھی ایمان اور اسلام کے مصالح سے اس دنیا کے کسی بڑے سے بڑے تعلق کے مصالح متصادم ہوں تو انسان کو اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ ایسے تعلق کو نہایت صبر و سکون کے ساتھ توڑ دے خواہ وہ موجودہ تہذیب کا "صنمِ اکبر" ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہ دنیا انسان کے برتنے کے لیے بنائی گئی ہے نہ کہ پوجنے کے لیے۔ خادم بنائی گئی ہے نہ کہ آقا۔ تابع اور مسخر بنائی گئی ہے نہ کہ الٰہ اور معبود۔ الدنیا خُلِقت لکم وانتم خلقتم للآخرۃ۔

مادّی تعلقات اور بشری جذبات کے متعلق قرآن کا اجمالی طور پر یہی اصولی نظریہ ہے۔ آئندہ ہم اسی اصل کی روشنی میں مخصوص طور پر وطنیت کے متعلق اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت کریں گے۔

(باقی)

مسلمانوں کے دینی مذہبی مرکز دیوبند کا علمی تاریخی ماہنامہ

"خالد"

نمونہ کا پرچہ مفت قیمت فی پرچہ (۲؍)

جو اکابر علمائے ہند بالخصوص حضرت مولانا الحاج محمد اعزاز علی صاحب ادیب دار العلوم دیوبند کی زیر قیادت نہایت آب و تاب کے ساتھ ہر مہینہ شائع ہوتا ہے جس میں بزرگان و علمائے امت کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اصلاحی، تمدنی، تاریخی مقالات نظم و نثر دیدہ زیب ہوتے ہیں۔ اپنے بلند پایہ مقالات کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں یہی ایک رسالہ ہے جو الحاد و دہریت کے پرفتن دور میں مسلمانوں کی متاعِ ایمانی کی حفاظت کرتا ہے۔ اکابر علمائے امت کے نادر و غیر مطبوعہ علوم و معارف صرف اس رسالہ کی اوراق زینت ہوتے ہیں۔ رسالہ "خالد" کا مطالعہ مسلمانوں کے ہر طبقہ کیلیے رشد و ہدایت کا ذریعہ اور دینی، دنیوی فلاح و بہبود کا ضامن ہے:۔ قیمت سالانہ مع محصولڈاک ذریعہ منی آرڈر پیشگی:۔ معاونین خاص سے ۶؍ عام خریداروں سے ۳؍ طلباء سے ۲؍

جملہ مراسلات و ترسیل زر کا پتہ:۔ (مولوی) سیّد احمد مدیر رسالہ "خالد" دیوبند (یو۔پی)